برِصغیر کے تراجمِ قرآن
کے بارے میں چند گزارشات

مولانا محمد اسحاق بھٹی

یہ خطۂ ارض جسے عربی اور فارسی کی قدیم کتبِ تاریخ میں "ہند" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور قیامِ پاکستان کے بعد جسے برصغیر پاک و ہند سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اب بنگلہ دیش بھی جس میں شامل ہے، ابتدائی صدی ہجری ہی میں اسلام کے روح پرور پیغام سے آشنا ہو گیا تھا۔

میں اس موقع پر اس موضوع کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا، صرف یہ عرض کروں گا کہ ہند پر عرب مسلمانوں کے حملوں کا آغاز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے صرف چار سال بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ۱۵ ہجری میں ہو گیا تھا۔ اسی سال حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت عثمان بن ابو العاص ثقفی رضی اللہ عنہ کو بحرین اور عمان کا والی مقرر کر کے بھیجا۔ حضرت عثمانؓ بن ابو العاص نے اپنے بھائی حضرت حکم بن ابو العاص رضی اللہ عنہ کو ایک لشکر کا کمانڈر بنا کر ہندوستان کی ایک بندرگاہ "تھانہ" پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔ موجودہ جغرافیائی اعتبار سے یہ بندرگاہ بمبئی کے قریب تھی۔ اب بھی اسے چھوٹی سی بندرگاہ کی حیثیت حاصل ہے۔

ایک روایت کے مطابق عثمانؓ بن ابو العاص نے اپنے ایک بھائی حکمؓ بن ابو العاص کو گجرات کاٹھیاواڑ میں تھانہ اور بھڑوچ کی طرف بھیجا اور دوسرے بھائی حضرت مغیرہؓ بن ابو العاص کو فوج دے کر دیبل پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔ یہ تینوں بھائی (یعنی عثمان، حکم اور مغیرہ رضی اللہ عنہم) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے۔ اس زمانے میں تھانہ، بھڑوچ اور دیبل بلاد ہندوسندھ کے تین اہم مقام تھے، جن پر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ نے سب سے پہلے پرچمِ اسلام لہرانے کا عزم کیا۔ عرب اصحابِ تاریخ "تھانہ" کو "تانہ" اور "بھڑوچ" کو (ص کے ساتھ) "بروص" بھی رقم

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

کرتے ہیں اور (س کے ساتھ) "بروس" بھی لکھتے ہیں۔

دیبل ایک مشہور تجارتی شہر تھا جو سندھ کے موجودہ شہر ٹھٹھہ کے قریب واقع تھا۔ جب مسلمان اور غیر مسلم فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے میں میدانِ جنگ میں اتریں تو اسلامی فوج کے کمانڈر حضرت مغیرہؓ بن ابوالعاص نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے' تلوار میان سے نکالی اور بسم اللہ فی سبیل اللہ کا نعرہ لگا کر دشمن پر ٹوٹ پڑے۔

عہدِ فاروقی میں بعض صحابہ کرامؓ کران اور مکران کے علاقوں میں بھی وارد ہوئے۔ وہاں جنگیں لڑیں اور اس نواح کے بہت سے حصوں کو فتح کیا۔ یہ علاقے اُس دور میں حدودِ سندھ میں واقع تھے۔ وہاں دربارِ خلافت سے بعض صحابہ باقاعدہ والی اور گورنر مقرر ہو کر آتے رہے۔ اس کی تفصیل تاریخ و جغرافیہ کی کتابوں میں مذکور ہے۔

تاریخی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ بعض صحابہ رَن کچھ کے علاقے میں بھی تبلیغ اسلام اور جہاد کے لئے تشریف لائے' جسے عربی زبان کی کتب تاریخ میں "کَس" لکھا گیا ہے۔ یہ علاقہ موجودہ جغرافیائی صورت حال کے مطابق ہندوستان میں واقع ہے اور اس کی حدود ایک طرف سے صوبہ گجرات' دوسری طرف سے صوبہ راجستھان اور تیسری طرف سے صوبہ سندھ سے ملحق ہیں۔

قلات' لس بیلہ اور بلوچستان کے علاقوں کو بھی چند صحابہ کرامؓ کی قدم بوسی کا شرف حاصل ہوا۔ اس زمانے میں بلوچستان کسی صوبے یا چند خاص مقامات تک محدود علاقے کا نام نہیں تھا۔ عربی تاریخوں میں اسے "بلوص" (صاد کے ساتھ) بھی لکھا گیا ہے اور (سین کے ساتھ) "بلوس" بھی۔ ملتان' لاہور' بنوں اور کوہاٹ کے شہروں اور علاقوں کی سرزمین بھی صحابۂ رسول کی پُر عظمت جماعت سے متعارف ہوئی۔ عرب مؤرخین ملتان کو ملتان بھی لکھتے ہیں اور مولتان بھی۔ لاہور کا نام لاہور بھی تحریر کیا گیا ہے اور لہور' لوہور اور لہاور بھی۔ بنوں کو بنہ اور کوہاٹ کو کہیں کوہات اور کہیں کہات رقم کیا گیا ہے۔ اس عہد میں ان علاقوں اور شہروں میں سے بعض اچھے خاصے بارونق شہر تھے اور بعض کی حیثیت چھوٹے چھوٹے دیہات یا کچھ بڑے قصبات کی تھی۔ آبادیاں دور دور تھیں' ایک دوسرے سے متصل اور قریب نہ تھیں۔ مختلف علاقوں اور ملکوں میں خاص قسم کی حد بندیاں بھی نہ تھیں۔

© rasailojaraid.c

تاریخ کی ورق گردانی سے پتا چلتا ہے کہ برصغیر کے کسی علاقے میں جن لوگوں نے سب سے پہلے قدم رکھے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے اور وہ حضرت عثمان بن ابو العاص ثقفی کے زیر کمان یہاں آئے تھے۔ یہ بحری بیڑے کے ذریعے سمندر کی تند و تیز لہروں پر تیرتے ہوئے یہاں آئے تھے۔ اور جس علاقے پر انہوں نے سب سے پہلے قدم رکھے وہ موجودہ بمبئی کے قریب بندر گاہ تھانہ تھی۔

اُن صحابہ کرام میں سے جو ۱۵ ہجری سے ۶۰ ہجری تک مختلف اوقات میں مختلف خلفاء کے دور میں واردِ بَرِصغیر ہوئے، صرف پچیس صحابہ کے نام تاریخ میں ملتے ہیں، جن میں سے بعض کا تذکرہ علامہ ابنِ حزم نے اپنی کتاب جمهرة انساب العرب میں کیا ہے اور انہیں خیار اور عالی مرتبت صحابہ قرار دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیائے فانی سے تشریف لے جانے کے صرف چار سال بعد ۱۵ ہجری میں صحابہ کی یہاں آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور وہ صحابہ کا زمانہ تھا۔ ظاہر ہے جو صحابہ بحری بیڑا تیار کر کے یہاں آئے، وہ دو چار ہی تو نہیں ہوں گے، کم سے کم دو یا تین سو تو ہوں گے جو اتنے بڑے ملک پر حملہ آور ہوئے۔ لیکن افسوس ہے ہمیں اس دور کی تاریخ ان کے نام نہیں بتاتی، صرف ان کے کمانڈر کا ذکر کرتی ہے، جو حضرت عثمان بن ابو العاص ثقفی تھے اور ابن حزم کے الفاظ میں "هُوَ كَانَ مِنْ خِيَارِ الصَّحَابَةِ"

بلاشبہ صحابہ کرامؓ کا یہ کاروانِ عالی قدر کاروانِ قرآن بھی تھا۔ صحابہ کرامؓ کی جماعت دنیائے انسانیت کی برگزیدہ ترین جماعت تھی۔ چشمِ فلک نے اس سے قبل اتنی کثیر تعداد میں اتنے بلند مرتبے کی حامل جماعت کبھی نہ دیکھی تھی۔ وہ اس نیلگوں آسمان کے نیچے اور اس خاکدانِ ارض کی سطح پر عمل و کردار، اطاعتِ رسولؐ اور تمسک بالقرآن کا عمدہ ترین نمونہ تھے۔ ان کی ہر حرکت، ان کا ہر فعل اور ان کی صبحیں اور شامیں احکامِ قرآن کے قالب میں ڈھل گئی تھیں۔ وہ جہاں جاتے، قرآن کے الفاظ و معانی ان پر سایہ فگن ہوتے اور اس کے اوامر و نواہی کی تمام تفصیلات و جزئیات پر عمل پیرا ہونا اپنا اولین فریضہ قرار دیتے تھے۔ وہ برصغیر میں آئے تو قرآن اپنی تمام برکتوں اور سعادتوں کے ساتھ ان کا رہنما تھا۔ انہوں نے خود بھی قرآن کو مدارِ عمل ٹھہرایا اور یہاں کے باشندوں کو بھی اس کی پاکیزہ تعلیمات سے روشناس کرایا۔ واضح الفاظ میں کہنا چاہیے کہ برصغیر میں آنے

© rasailojaraid.c

والے صحابی اس خطے یعنی قارۃ السند میں قرآن کے سب سے پہلے معلم تھے۔ معلوم نہیں اس زمانے میں درسِ قرآن کا کیا طریقہ تھا، لیکن اس میں قطعاً کوئی شک نہیں کہ یہاں درسِ قرآن کا آغاز انہی پاک باز لوگوں نے کیا۔ سینۂ لاہوت کے اس آخری بول اور کتابِ ہدیٰ کی پاکیزہ ترین تعلیمات کو اس برصغیر میں پھیلانے اور عام کرنے والا پہلا گروہ وہی تھا۔

اس قدسی صفات جماعت کے بعد ۹۳ھ میں محمد بن قاسم رحمۃ اللہ کے حملے کے وقت اسلام یہاں اپنی پوری طاقت کے ساتھ آیا اور پھر درسِ قرآن و حدیث کے بے شمار حلقے قائم ہو گئے، مسجدیں تعمیر کی گئیں اور مدرسے معرضِ قیام میں لائے گئے۔ چنانچہ قرآن مجید کا پہلا ترجمہ اسی خطۂ ارضی کی ایک زبان میں کیا گیا، جسے سندھی زبان کہا جاتا ہے۔ یہاں کے غیر مسلم حکمرانوں نے بھی قرآن سے دلچسپی لی اور اس کے احکام و اوامر کو آویزۂ گوش بنانے اور اس کی تعلیمات کو قلب و روح کی تہہ میں اتارنے کا عزم کیا۔

اس سلسلے کا ایک واقعہ جو سندھ کے ایک گم نام عالم اور مفسرِ قرآن سے تعلق رکھتا ہے "عجائب الہند" میں بزرگ بن شہریار نے بیان کیا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص ابو محمد حسن بن عمرو نجیدی کہتے ہیں کہ میں ۲۸۸ھ میں سندھ کے شہر منصورہ میں مقیم تھا۔ وہاں کے بعض ثقہ لوگوں نے مجھے بتایا کہ ۲۷۰ھ میں سندھ کا والی عبداللہ بن عمر ہباری مقرر ہوا۔ اس کا دارالحکومت منصورہ تھا۔ ۲۷۰ھ ہی کی بات ہے کہ سندھ کے ایک اور شہر ارور کے ہندو راجا نے، جسے وہاں کے عرب لوگ مہروک کہتے تھے، منصورہ کے حاکم عبداللہ بن عمر ہباری سے درخواست کی کہ اس کو سندھی زبان میں اسلام کی بنیادی تعلیمات سے متعلق معلومات قلم بند کر کے بھیجی جائیں۔ راجا مہروک کی یہ درخواست پڑھ کر عبداللہ بن عمر ہباری نے ایک شخص کو بلایا جو اصلاً باشندہ تو عراق کا تھا، لیکن اس کی تعلیم و تربیت منصورہ میں ہوئی تھی۔ وہ نہایت ذہین، قوی حافظہ اور سمجھ دار آدمی تھا اور برصغیر کی متعدد زبانیں جانتا تھا۔ عبداللہ نے اس کے سامنے راجا مہروک کی درخواست کا ذکر کیا اور کہا کہ اس کو اسلام کے بارے میں معلومات بہم پہنچائی جائیں۔ عبداللہ کی بات سن کر اس عالم نے اشعار میں ایک تحریر لکھی اور راجا مہروک کی خواہش کے مطابق اس میں اسلام کی بنیادی تعلیمات بیان کر دیں۔ عبداللہ نے یہ تحریر راجا

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

مہروک کو بھیج دی۔ راجا نے یہ تعلیمات پڑھیں تو بہت خوش ہوا اور عبداللہ سے درخواست کی کہ اس عالم کو اس کے دربار میں بھیجا جائے۔ عبداللہ نے اسے دربار میں بھیج دیا اور وہ تین سال وہاں مقیم رہا۔ اس اثناء میں راجا اس سے اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا۔ ۲۷۳ھ میں وہ عالم' والیٔ سندھ عبداللہ سے ملا۔ عبداللہ نے اس سے راجا مہروک کے متعلق کچھ سوالات کیے تو اس نے بتایا کہ جس وقت میں وہاں سے چلا ہوں اس وقت وہ صدقِ دل سے اسلام قبول کر چکا تھا' لیکن حکومت چھن جانے کے خطرے کے پیش نظر اس کا اظہار نہیں کرتا تھا۔

اس عالم نے راجا مہروک سے متعلق جو واقعات بیان کیے' ان میں ایک واقعہ یہ بیان کیا کہ راجا نے اس سے سندھی زبان میں قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کی فرمائش کی' چنانچہ اس کی فرمائش کے مطابق وہ روزانہ چند آیات کی تفسیر لکھتا اور اسے سنا دیتا۔ جب وہ سورۂ یٰسین کی اس آیت پر پہنچا کہ "مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ" اور اس کا ترجمہ سنایا اور تفسیر بیان کی تو راجا اس وقت جواہرات سے مرصّع سونے کے تخت پر بیٹھا تھا۔ اس نے کہا ایک دفعہ پھر اس کا ترجمہ اور تفسیر بیان کرو۔ چنانچہ دوبارہ ترجمہ و تفسیر بیان کیا گیا تو راجا فوراً تخت سے نیچے اترا اور چند قدم چلا۔ پھر پیشانی زمین پر رکھ دی۔ حالانکہ زمین پر پانی چھڑکا ہوا تھا اور وہ بہت تر ہو چکی تھی۔ راجا اس قدر رویا کہ اس کے رخساروں پر مٹی کی تہہ جم گئی۔ پھر اس نے سر اٹھایا اور کہا: "بے شک وہی رب ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہنے والا ہے"۔ اس کے بعد اس نے ایک مکان تیار کرایا' جہاں وہ روزانہ تنہائی میں خدا کی عبادت کرتا اور وقت پر نماز پڑھتا تھا۔ مگر لوگوں پر یہ ظاہر کرتا کہ وہ تنہائی میں سلطنت کے اہم معاملات پر غور کیا کرتا ہے۔ سندھ کا یہ ایک گمنام عالم اور مفسر تھا' اور غیر عربی زبانوں میں سندھی وہ پہلی زبان ہے' جسے قرآن مجید کا ترجمہ و تفسیر کرنے اور اسلامی تعلیمات کو اشعار کے قالب میں ڈھالنے کا شرف حاصل ہوا۔

برصغیر میں قرآن مجید کے تراجم و تفاسیر کی ایک تاریخ ہے جو اپنے اندر بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ قرآن مجید سے تعلق رکھنے والے حضرات کو اس موضوع میں خاص طور سے دلچسپی لینی چاہیے۔ یہ مختصر صحبت اس کی تفصیل کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

شیخ علی بن احمد مہائمی دکنی گجراتی نے' جو ۸۳۵ھ میں فوت ہوئے' "تبصیر الرحمٰن و

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

تیسیر المعان فی تفسیر القرآن" کے نام سے عربی میں تفسیر لکھی جو ریاست بھوپال کے سابق دارالمہام منشی جمال الدین کی سعی و کوشش سے چار جلدوں میں قاہرہ سے شائع ہوئی۔ اس کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آیاتِ قرآنی کا باہم ربط ثابت کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں بہت سے مفید اور معلومات افزا مباحث معرضِ بیان میں آئے ہیں۔

قاضی شہاب الدین احمد دولت آبادی نے ایک روایت کے مطابق ۸۴۰ھ میں اور ایک روایت کی رُو سے ۸۴۲ھ میں وفات پائی۔ انہوں نے "بحرِ مَوّاج" کے نام سے فارسی میں تفسیر لکھی۔

قرآن مجید کا برصغیر میں پہلا فارسی ترجمہ مغل بادشاہ نورالدین محمد جہاں گیر (متوفیٰ ۱۰۳۷ھ) کے عہد میں ہوا۔ جہاں گیر نے اپنے عہد کے ایک مشہور عالم شیخ محمد بن جلال الدین حسینی گجراتی سے ترجمہ قرآن کی درخواست کی اور کہا کہ ترجمہ لفظی، عام فہم اور آسان ہونا چاہئے۔ ترجمے کے الفاظ اور اس کی زبان میں کسی قسم کا تصنّع اور تکلف نہیں ہونا چاہئے۔ اس ترجمے کا قلمی نسخہ ہندوستان کے صوبہ راجستھان کے ایک شہر جے پور میں ایک عالمِ دین مولانا عبدالرزاق کے پاس موجود ہے۔ اس کے بعد دوسرا فارسی ترجمہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا ہے۔

برِصغیر کے اردو تراجم میں ڈپٹی نذیر احمد، مولانا اشرف علی تھانوی، مولوی فتح محمد جالندھری، شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا احمد رضا خان کے تراجم کا ذکر تو کیا جاتا ہے، لیکن مرزا حیرت دہلوی کے ترجمے اور مولانا ثناء اللہ امرتسری کے ترجمۂ قرآن اور ان کی اردو اور عربی کی تفسیروں کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ پھر علمائے غزنویہ کی خدماتِ قرآن میں سے حمائلِ غزنویہ کا نام آخر کیوں نہیں لیا جاتا، جس کی چند سال پہلے تک اہلِ علم میں بہت مانگ تھی۔ پنجابی ترجموں کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی، معلوم نہیں اس کی کیا وجہ ہے۔ مولانا احمد علی صاحب کے ترجمۂ قرآن کا تذکرہ بھی کم ہی کیا جاتا ہے۔

آج سے چون پچپن سال پیشتر (۱۹۳۵-۳۶ء میں) قرآن مجید کا ایک ترجمہ سید محمد شاہ ایم اے نے کیا تھا جو لاہور کے ایک قدیم اشاعتی ادارے پیکو لیمیٹڈ نے نہایت اہتمام سے خوب صورت انداز میں شائع کیا تھا۔ اس ترجمے کا نام "مطالب الفرقان فی ترجمۃ

© rasailojaraid.com

القرآن" ہے۔ اس پر نظرثانی مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا شہاب الدین فاضل دیو بند اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے کی تھی۔ اس کا ذکر کرنے سے بھی احتیاط ہی سے کام لیا جاتا ہے۔ مولانا محمد حنیف ندوی کی تفسیر "سراج البیان" جو پہلی مرتبہ ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی تھی اور پھر چودہ پندرہ مرتبہ چھپی، یہ تفسیر اگرچہ مختصر ہے، مگر بہت عمدہ ہے۔ اسے بھی عام طور پر قلم و زبان کے دائرے سے باہر ہی رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح برِصغیر کے بعض دیگر علمائے کرام نے بھی ترجمہ و تفسیر کی صورت میں قرآن مجید کی خدمات انجام دیں مگر خدا جانے ان کا نام لینا اور ان کی خدمتِ قرآن کا ذکر کرنا کیوں مناسب نہیں سمجھا جاتا اور چند حضرات ہی کے نام و کام کے تذکرے پر کیوں کفایت کی جاتی ہے۔

آزادیٔ برصغیر سے کافی عرصہ پہلے لاہور میں درسِ قرآن کے دو حلقے قائم تھے، ایک مولانا احمد علی صاحب کا شیرانوالہ گیٹ کی مسجد میں اور دوسرا مولانا غلام مرشد صاحب کا سنہری مسجد رنگ محل میں۔ ۱۹۳۰ء میں ایک تیسرا حلقۂ درس قائم ہوا، وہ تھا مولانا محمد حنیف ندوی کا حلقۂ درس مسجد مبارک (متصل اسلامیہ کالج ریلوے روڈ) میں۔ مولانا محمد حنیف ندوی ۱۹۳۰ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فارغ التحصیل ہو کر آئے تھے، اُس وقت ان کی عمر صرف بائیس برس کی تھی، جب کہ مولانا احمد علی صاحب اور مولانا غلام مرشد صاحب ان سے عمر میں کافی بڑے تھے اور پہلے سے لاہور میں اپنا خاص اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ اس کے برعکس مولانا حنیف ندوی نو وارد بھی تھے اور نو عمر بھی، لیکن ان کے حلقۂ درس نے لاہور میں بڑی شہرت حاصل کی۔ اسلامیہ کالج کے طلباء اور اساتذہ بھی اس میں شامل ہوتے تھے اور دیگر حضرات بھی۔ اس فہرست میں اُس دور کے بڑے بڑے اخبار نویسوں، ممتاز ادیبوں، مشہور سیاسی لیڈروں اور معروف مقرروں کے نام بھی ملتے ہیں۔

اس زمانے میں پیکو لمیٹڈ کی طرف سے ایک ماہانہ رسالہ "حقیقتِ اسلام" کے نام سے شائع ہوتا تھا، جس کے مدیرِ مسئول تو پیکو کے مالک و منتظم ماسٹر محمد احسان تھے، مگر اسے مرتب مولانا محمد حنیف ندوی کرتے تھے۔ پیکو لمیٹڈ والوں نے ۱۹۳۶ء میں قرآن کی تبلیغ و اشاعت کے لئے ایک "مجلس اشاعتِ قرآن" بنائی تھی، جس کے ماہانہ جلسے برکت علی محمڈن ہال (لاہور) میں منعقد ہوتے تھے۔ ان میں مولانا محمد حنیف ندوی، ملک نصراللہ خاں عزیز اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی قرآن مجید کے مختلف عنوانات پر تقریریں کرتے تھے

© rasailojaraid
© rasailojaraid

اور اس کی روئداد "حقیقت اسلام" میں شائع ہوتی تھی۔ یہ تفصیلات میں نے اسی زمانے میں اس رسالے میں پڑھی تھیں، جب کہ میری عمر بارہ تیرہ سال کی تھی۔ اس ضمن کی بہت سی باتیں میرے ذہن میں محفوظ تھیں۔ تھوڑا عرصہ پیشتر جب مولانا حنیف ندوی کے بارے میں "ارمغانِ حنیف" کے نام سے ایک مستقل کتاب کی ترتیب کا مسئلہ سامنے آیا تو مجھے رسالہ "حقیقتِ اسلام" کی ضرورت پڑی، لیکن تلاش بسیار کے بعد پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے عتیقی کلکشن میں صرف اس کا ایک شمارہ مل سکا جو جنوری ۱۹۳۷ء کا شمارہ ہے۔ اس میں اس موضوع سے متعلق جو باتیں مل سکیں، وہ "ارمغانِ حنیف" میں درج کر دی گئی ہیں۔ "ارمغانِ حنیف" دراصل چند قابلِ احترام حضرات کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ان سے مولانا کے بارے میں لکھوائے گئے۔ اس بندۂ عاجز کے چار مضمون بھی اس میں شامل ہیں۔ یہ کتاب حال ہی میں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ نے شائع کی ہے۔

© rasailojaraid.

باغِ جناح (لاہور) میں جہاں اب مسجد دار السلام تعمیر ہے، جس میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب خطبۂ جمعہ ارشاد فرماتے ہیں، اور لائبریری دار السلام بھی قائم ہے، وہاں ۱۹۵۴ء میں ڈاکٹر کرنل سلامت اللہ مرحوم کی تحریک پر سب سے پہلے مولانا محمد علی قصوری (ایم اے کینٹب) مرحوم نے درسِ قرآن کا آغاز کیا تھا۔ ابتداء میں یہ درس ہر اتوار کی صبح کو ہوتا تھا، بعد میں شام کو ہونے لگا تھا۔ اس پُرفضا جگہ میں دو تین صفیں بچھا دی جاتی تھیں۔ مغرب کی نماز سے آدھ پون گھنٹہ پہلے مولانا محمد علی قصوری کا درسِ قرآن ہوتا تھا۔ پھر وہیں ان کی امامت میں نمازِ مغرب ادا کی جاتی تھی۔ شروع شروع میں شام کو سیر کے لئے آنے والے چند حضرات اس میں شامل ہوتے تھے، لیکن بعد کو کافی حاضری ہونے لگی تھی۔ مجھے یاد ہے "نوائے وقت" میں مشہور صحافی م ش (میاں محمد شفیع) نے اس پر کالم لکھا تھا، جس میں درسِ قرآن کے اس سلسلے کی تحسین کی تھی اور لوگوں کو اس میں شریک ہونے اور اس سے استفادہ کرنے کی تلقین کی تھی۔ نیز مولانا محمد علی قصوری سے درخواست کی تھی کہ وہ اس نیک اور اہم کام کو جاری رکھیں۔ مولانا محمد علی قصوری نے ۱۲ جنوری ۱۹۵۶ء کو وفات پائی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بڑے بھائی مولانا محی الدین احمد قصوری نے اس سلسلے کو جاری رکھا۔ وہ کبھی کبھی مولانا حنیف ندوی کو ساتھ لے

© rasailojaraid.

جاتے اور مولانا ندوی درس قرآن دیتے تھے۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا سلسلۂ درسِ قرآن اپنی جگہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے اور بعض امور میں اپنے پیشرو حضرات سے مختلف ہے۔ انہوں نے اس کا آغاز اگرچہ لاہور سے کیا، لیکن اسے لاہور تک محدود نہیں رکھا، پورے ملک میں اس کو پھیلا دیا، بلکہ ملک سے باہر بھی مشرق و مغرب میں ان کی صدائے اشاعت قرآن گونجی اور اس افسردۂ نور اور صحیفۂ مقدسہ کے نشرو ذیوع کے لئے ان کی تگ و تازِ مجاہدانہ نے بڑی وسعت اختیار کی۔ میں نے ان کا نام تو سنا تھا، لیکن ان کو دیکھنے اور ان کی تقریر سننے کا موقع نہیں ملا تھا۔ آج سے تیئس برس پہلے ۱۹۶۷ء میں ایک دن پروفیسر محمد سرور جامعی نے ان کا ذکر کیا۔ وہ کرشن نگر کی ایک مسجد میں ان کا درسِ قرآن سن کر آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر اسرار احمد کی آواز مقررانہ اور لہجہ صاف ستھرا ہے۔ وہ پورے زور اور اعتماد سے اپنی بات لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ اس سے کچھ دن بعد مجھے ان کا درس سننے کا اتفاق ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کے دل میں قرآن کی محبت، درد، سوز، تڑپ، خلوص، ولولہ اور جذبہ و داعیہ سب عناصر موجود ہیں۔ بات کہنے کا ڈھنگ خوب جانتے ہیں اور جامعیت سے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے ہیں۔ اور یہ وہ خصوصیات ہیں جن سے ایک داعی اور مبلّغ کا بہرہ ور ہونا ضروری ہے۔ اس پر چار پانچ مہینے گزرے ہوں گے کہ مولوی محی الدین سلفی مرحوم کے ساتھ ان سے ملاقات ہوئی اور پھر آہستہ آہستہ یہ ملاقات تعلقات و مراسم میں بدل گئی۔

اب صورت حال یہ ہے کہ میں کسی معاملے میں ڈاکٹر صاحب سے اختلاف تو کر سکتا ہوں، اور اختلاف کس سے نہیں ہوتا، لیکن ان کی مخالفت نہیں کر سکتا۔ میرے نزدیک اختلاف اور مخالفت میں بہت فرق ہے۔ اس کا بہرحال خیال رکھنا چاہئے کہ اختلاف کی حد کہاں ختم ہوتی اور مخالفت کی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب بقولِ خود قمری حساب سے ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ گئے ہیں اور میں "عمرِ نبوت" میں داخل ہو گیا ہوں۔ اس اعتبار سے میں ان کا "بزرگ" ہوں اور اس لئے "بزرگ" کی حیثیت سے دعاگو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو خدمتِ قرآن کی مزید توفیق عطا فرمائے اور ان کو صحت و توانائی سے نوازے۔

© rasailojaraid
© rasailojaraid

اس موقع پر ایک بات اور عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا' وہ یہ کہ ڈاکٹر صاحب نے فروری ۱۹۹۰ء کے "حکمت قرآن" کے صفحہ ۱۳۶ پر لکھا ہے کہ "۱۹۵۵ء میں راقم جماعت اسلامی کا رکن بنا اور بدقسمتی سے اس کے فوراً بعد ہی اس نے شدت کے ساتھ محسوس کرلیا کہ جماعت اسلامی کی تحریک اپنی اصل اساسات سے منحرف ہو چکی ہے"۔ آگے چل کر فرماتے ہیں: "اپریل ۱۹۵۷ء میں راقم نے جماعت کی رکنیت سے استعفاء دے دیا"۔ سوال یہ ہے کہ یہاں "بدقسمتی" کا لفظ استعمال کرنے میں کیا مصلحت کارفرما تھی۔ یہ تو خوش قسمتی کی بات ہے۔ خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ وہ اس سے الگ ہو گئے اور خدمتِ قرآن کو مرکزِ التفات ٹھہرا لیا۔ اگر جماعت میں رہتے تو اب تک کئی الیکشن لڑ چکے اور ہار چکے ہوتے۔ رات دن سر پر یہی دُھن سوار رہتی۔ قرآن کے بارے میں کوئی بات ہی نہ ہوتی اور وہ ایک [illegible] کرتا ہے۔

اس موقع پر ایک لطیفہ یاد آگیا۔ دو دیہاتی شہر میں میلہ دیکھنے گئے تو وہاں کشتی ہو رہی تھی۔ ان میں سے بھی ایک شخص نے کشتی لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ اس نے ایک شہری سے کشتی لڑی' شہری پہلوان نے اسے چِت کر دیا۔ اس نے کہا اب لڑو' پہلے میں پوری تیاری میں نہ تھا۔ پھر لڑی' پہلوان نے اسے پھر پچھاڑ دیا۔ تیسری مرتبہ پھر کہا کہ ہمت ہے تو اب لڑو' اب میں دیکھوں گا تم کتنے پانی میں ہو۔ پھر لڑی' پھر ہار گیا۔ چوتھی مرتبہ پھر کہا اب لڑ کر دیکھو۔ شہری پہلوان نے جواب دیا: "میں میلہ ویکھاں یا تینوں ڈھان چ رہواں" (یعنی میں میلہ دیکھوں یا تمہیں پچھاڑنے ہی میں رہوں؟) ---- تو ڈاکٹر صاحب اگر قرآن مجید کی تبلیغ و اشاعت کی طرف عنانِ توجہ مبذول نہ کرتے اور پہلی حالت میں رہتے تو ساری عمر کشتی لڑنے' بار بار مدِمقابل کو للکارنے اور ہارنے میں گزار دیتے۔ وہ یقین رکھیں ان کا دوسرا فیصلہ پہلے فیصلے سے کہیں بہتر ہے۔ میں قرآن کے الفاظ میں ان سے عرض کروں گا: وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ○

آخر میں تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں' جنہوں نے میری اکھڑی اکھڑی اور بے ربط گزارشات کو سننے کی زحمت گوارا فرمائی' اور ڈاکٹر صاحب کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے یاد فرمایا اور کچھ باتیں عرض کرنے کا موقع فراہم کیا۔

(یہ مقالہ "محاضراتِ قرآنی" منعقدہ اپریل ۱۹۹۰ء' کی ایک نشست میں پڑھ کر سنایا گیا)

© rasailojaraid.com